خَیرامّۃ کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اُس کا ہاتھ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے ہرگز نہ پھیلے

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۶؍اکتوبر ۱۹۷۳ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہّد وتعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے سورہ آل عمران کی آیۂ کریمہ کا یہ حصہ پڑھا:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (اٰل عمران:۱۱۱)

پھر حضور انور نے فرمایا:-

ویسے تو مومن کی زندگی کا ہر لمحہ ہی دعاؤں میں مشغول رہنا چاہیئے لیکن بعض ایام (مثلاً رمضان اور اس میں بھی آخری عشرہ) کو قبولیت دعا سے خاص نسبت ہے۔ جب قربانیاں زیادہ مانگی جاتی ہیں تو قبولیت دعا کی بشارتیں بھی زیادہ دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے بھی زیادہ کھولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل موسلا دھار بارش سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ آسمانوں سے نازل ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے عاجز بندوں کی روحانی سیری کا سامان پیدا کرتا ہے۔

میں نے اپنے ایک پہلے خطبہ میں بھی بتایا تھا کہ رمضان کا مہینہ دعاؤں کا مہینہ ہے اس لئے میں نے اپنی جماعت کو بہت سی دعاؤں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ آج ماہ رمضان کا آخری جمعہ ہے۔ رمضان کے مبارک ایام اور جمعہ کی مبارک ساعتیں ہمیں میسر ہیں اس لئے آج پھر

میں احباب جماعت کو بعض دعاؤں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے ہماری زندگی کا ویسے تو ہر لمحہ ہی دعا کے غلاف میں لپٹا ہوا اپنے رب کریم کے حضور پیش ہونا چاہیئے لیکن اس وقت میں چند خاص دعاؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

میں نے اس وقت قرآن کریم کی آیت کے جس ٹکڑے کی تلاوت کی ہے اس کے ایک حصے کی طرف ہی توجہ دلاؤں گا اور وہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے لئے ایسے سامان پیدا کئے گئے ہیں کہ تم تمام امتوں اور جماعتوں سے زیادہ برکت والی امت اور خیر والی جماعت بن سکتے ہو اور یہ اس لئے کہ قرآن عظیم ایک کامل شریعت کی شکل میں نوعِ انسانی کے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ اس میں امت مؤمنہ اور امت مسلمہ کے لئے روحانی اور دوسری رفعتوں کے سامان بھی بہت زیادہ مہیا کئے گئے ہیں۔

پس خَيْرَ أُمَّةٍ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک بنیادی چیز ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تم سے بڑھ کر، تم سے بہتر اور تم سے افضل کوئی اور گروہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جس قدر رفعتوں تک پہنچنے کے سامان امت مسلمہ کو دئے گئے ہیں اس قدر رفعتوں تک پہنچنے کے سامان پہلی امتوں کو نہیں دئے گئے تھے۔ چنانچہ خَيْرَ أُمَّةٍ میں ایک بڑا وسیع مضمون بیان ہوا ہے اور دراصل ساری قرآنی تعلیم ہمیں اسی طرف لا رہی ہے۔

تاہم جہاں تک لفظ خیر کا تعلق ہے قرآن کریم میں بعض جگہ اس کے استعمال سے لفظاً اور بعض جگہ معناً یہ بتایا گیا ہے کہ خیر امت کی کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔ اسی طرح حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی لفظاً اور معناً ہر دو لحاظ سے خیر امت کی صفات کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ اس وقت میں ''خیر'' کی دو ایسی صفات کی طرف احباب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں جن میں خیر کا لفظ معناً بھی استعمال ہوا ہے اور لفظاً بھی۔

چنانچہ خیر امت بننے کے لئے ہمیں ایک یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ ہم اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والے بنیں۔ نہ صرف ہم اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے والے ہوں بلکہ ہم دنیا جہاں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے بھی ہوں

نہ صرف یہ کہ ہم خود دوسروں کے سامنے مدد کے لئے ہاتھ نہ پھیلائیں بلکہ جب ہمارے سامنے دنیا جہاں کے ہاتھ لمبے ہوں اور ہمارے سامنے امداد کے لئے ہاتھ پھیلائے جائیں تو ہم اُن کے ہاتھوں کو ان کی وسعت سے زیادہ بھر دینے والے ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا تعلق امت کے اندر باہمی معاونت کرنے سے ہے اور دوسرے کا تعلق مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ بھلائی کرنے سے ہے۔

آپ نے فرمایا: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى (مسلم کتاب الصلوٰۃ) گویا اس میں لفظاً بھی اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو ''خیر امت'' میں پنہاں ہے یعنی امت مسلمہ کا ہاتھ، مومنوں کے گروہ کا ہاتھ ہمیشہ عُلیا یعنی بالا رہنا چاہیئے۔ اُن کا ہاتھ دینے والا ہونا چاہیئے سُفلیٰ یعنی لینے والا نہیں ہونا چاہیئے۔

جب ہم اپنی تاریخ یعنی امت مسلمہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے لے کر اس وقت تک دو زمانے نظر آتے ہیں۔ ایک زمانہ تو وہ ہے جس میں خیر امت کی یہ حقیقت بڑی نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اُن کا ہاتھ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى نہیں ہے۔ پھر ایک وہ زمانہ ہے جس میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس بنیادی حقیقت پر عمل پیرا رہنے میں کچھ فرق پڑ گیا۔ وہ ہاتھ جو ہمیشہ دینے کے لئے پیدا کیا گیا تھا وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے دوسروں کے سامنے لینے کے لئے پھیلنے لگا حالانکہ ایک حقیقی مسلمان کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے پھیل ہی نہیں سکتا ورنہ توحید کیا ہوئی اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کے کیا معنی رہے۔

اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں ایک وہ وقت تھا کہ قریباً سارے مسلمانوں کو (شاید ہی کوئی مسلمان چھپا ہوا باہر رہ گیا ہو) شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا اور قریباً اڑھائی سال تک قید میں رکھ کر مسلمانوں کو بھوکا مارنے کی کوشش کی گئی لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان دکھ دہ حالات میں انتہائی مجبوری کے حالات میں بھی اُمت مسلمہ (گو اس وقت تھوڑی سی جماعت تھی، مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا اس میں شک نہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اُن) کا ہاتھ غیر کے سامنے نہیں پھیلا۔ مسلمان اڑھائی سال تک شعب ابی طالب میں محصور و مقید رہے۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ اُن کا ہاتھ غیر کے سامنے نہیں پھیلا حالانکہ اس قسم کے حالات میں عام دُنیوی نگاہ رکھنے والے اور خدا پر توکل نہ رکھنے والے لوگوں کا ہاتھ یقینی طور پر دوسرے کے سامنے پھیلے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے نہ صرف مال و دولت میں ترقی کی اور دُنیا کو مالا مال کیا بلکہ اپنے علم و فضل سے بھی دُنیا کو مستفید کیا۔ چنانچہ ایک لمبے عرصہ تک علم لینے کے لئے، علم کے حصول کے لئے بڑے بڑے مشہور پادری تک مسلمانوں کی درس گاہوں میں آتے تھے۔ اب ظاہر ہے جو علم دینے والا ہاتھ ہے وہ الید العلیاء ہے اور جو علم لینے والا اور علم حاصل کرنے والا ہاتھ ہے وہ الید السفلٰی ہے۔

غرض ایک وقت تک زندگی کے ہر میدان میں دُنیوی لحاظ سے بھی اور دینی لحاظ سے بھی، اقتصادی لحاظ سے بھی اور معاشرتی لحاظ سے بھی، نئی نئی ایجادات کے لحاظ سے بھی اور نئی نئی ایجادات سے فوائد کے حصول کے لحاظ سے بھی غرض ہر نقطہ نگاہ سے ہمیں مسلمانوں کا ہاتھ بالا نظر آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک مسلمانوں کا ہاتھ بالا رہے اُسی وقت تک مسلمان حقیقی معنی میں خیر امت کہلائے جا سکتے ہیں ورنہ وہ خیر امت کی ایک بنیادی صفت سے محروم سمجھے جائیں گے۔ پس چونکہ خیرا مت کی ایک بنیادی صفت الید العلیاء کا ہونا ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الید العلیاء خیر ہے۔ اس لئے اس خیر کے ساتھ اس خیر (امت) کا تعلق بتا دیا۔ دونوں چیزوں کو آپس میں چسپاں کر دیا لیکن اس وقت بعض مسلمانوں کی دُنیا بدل گئی ہے۔ اب ہمیں جو نظارہ دکھائی دیتا ہے وہ بڑا تکلیف دہ ہے مثلاً پاکستان کو لے لیں۔ غیر ملکی امداد پر اتنا انحصار ہے کہ جب ہم اس کے متعلق سوچتے ہیں اور قرآن کریم پر غور کرتے ہیں اور خیر امت کی صفات (جیسا کہ قرآن کریم و حدیث میں بیان ہوئی ہیں اُن) کو سامنے رکھتے ہیں تو ہمارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس چیز سے اتنی شدت کے ساتھ روکا گیا تھا اور جو امت مسلمہ کی ایک بنیادی علامت قرار دی گئی تھی اُسے ہم بھول گئے ہیں اور اب نہ صرف یہ کہ آج ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں رہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم دوسروں کے دست نگر بن گئے ہیں۔

پچھلے ۲۵ سال (یعنی پاکستان کی زندگی کی ابتداء) سے ہم نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہمارے بعد ایک نیا ملک دُنیا میں اُبھرا۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی لحاظ سے ایک نیا بچہ پیدا ہوا جو پاکستان سے دو سال چھوٹا ہے، چین اس کا نام ہے غیر مسلم ہے۔ دہریہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتا اس لحاظ سے قابل رحم ہے لیکن وہ اس بنیادی حقیقت سے واقف ہے اور انتہائی قابل تعریف صفت اس میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اُس نے کہیں سے بھی مدد نہیں لینی بلکہ اپنی مدد آپ کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ چنانچہ اب اُن کی یہ حالت ہے کہ نہ صرف بحیثیت قوم بلکہ انفرادی طور پر بھی عوام میں یہ جذبہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ کسی سے مدد نہیں لینی۔ اگر چہ چین کا نام اس وقت بہت اونچا ہو گیا ہے لیکن آج بھی وہاں علاقوں کے علاقے ایسے ہیں جہاں کے باشندوں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی۔ بایں ہمہ اُن کی عزت نفس کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی حکومت سے بھی قرض لینے کے روادار نہیں۔ ایسی صورت میں وہ اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ جس وقت تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے اور اپنے لئے اپنی ضرورتوں کے مطابق پیدا نہیں کر لیتے اس وقت تک خواہ اُنہیں بھوکا کیوں نہ رہنا پڑے وہ ہر دُکھ اور مصیبت اُٹھائیں گے مگر کسی سے قرض نہیں مانگیں گے لیکن ہماری یہ حالت ہے کہ ہم جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں۔ ہماری طرف سے اس قسم کی کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی۔ اب پی پی پی (پاکستان پیپلز پارٹی) کی نئی حکومت کوشش کر رہی ہے۔ خدا کرے کہ اُنہیں صحیح راہوں کی نشاندہی ہو جائے اور وہ ترقی کر سکیں لیکن دُنیا کی باتیں تو دُنیا کی باتیں ہیں، میں اس وقت قرآن کریم کی بات کر رہا ہوں۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ خیر امت وہ امت ہے جس کے اندر یہ بنیادی صفت پائی جاتی ہو کہ اُس کا ہاتھ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ پھیلے۔ پس وہ وجود، وہ گروہ، وہ جماعت، وہ قوم اور وہ ملک جس کا ہاتھ غیر اللہ کے سامنے پھیل گیا وہ حقیقی معنے میں تو خیر امت کا حصہ نہیں رہا۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ قریباً چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں دُنیا کے کسی نہ کسی حصے میں، دُنیا کے کسی نہ کسی ملک میں دُنیا کی کسی نہ کسی جماعت میں ہمیں یہ صفت ضرور نظر آتی ہے۔ یعنی امت مسلمہ مجموعی طور پر اس صفت سے خالی نظر نہیں آتی۔ بلکہ امت مسلمہ میں

ایسے گروہ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں جن کا ہاتھ خدا کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں پھیلا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے خدا تعالیٰ پر پورا توکل رکھتے تھے اور رکھتے ہیں اور صبر سے کام لیتے تھے اور لیتے ہیں۔ اب مثلاً جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں کچھ عرصہ بھوکا رہ لوں گا مگر کسی سے مانگ کر نہیں کھاؤں گا۔ اس صورت میں صبر کی ضرورت ہے اُسے کچھ عرصہ صبر سے کام لینا پڑے گا۔ اسی لئے صبر اور توکل کو قرآن کریم میں کئی جگہ اکٹھا کر دیا گیا ہے کیونکہ صبر کا تعلق توکل علی اللہ سے بہت زیادہ ہے۔

غرض اسلام کسی کے دل میں مایوسی نہیں پیدا کرتا۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا۔ ہم اس کے عام طور پر یہ معنے کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ یہ درست ہے، اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس لحاظ سے بھی ہمارے دل میں مایوسی پیدا نہیں ہونی چاہیئے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس کے علاوہ بھی انسانی زندگی کے ہزاروں پہلو ایسے ہیں جن میں انسان اگر صحیح اسلامی تعلیم پر عمل کر رہا ہو تب بھی حصول مقصد اور ابتدائی کوشش میں ایک فاصلہ ضرور ہوتا ہے۔ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کی ابتدا کرتا ہے تو اس وقت وہ بے صبری سے کام نہیں لیتا بلکہ صبر کرتا ہے اور بشاشت کے ساتھ دکھ اور پریشانی اُٹھاتا ہے یعنی دُنیا کی نگاہ میں وہ دُکھ ہوتا ہے یا جسمانی تکلیف ہوتی ہے یا بعض اور تکالیف ہوتی ہیں جن میں سے انسان کو گذرنا پڑتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں انسان کو جو راحت نصیب ہوتی ہے اس سے سارے دُکھ درد کافور ہو جاتے ہیں۔

پس اس سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صبر اور توکل علی اللہ کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے وہاں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ہر انتہا ایک ابتدا کی محتاج ہے۔ اگر کسی کام کی ابتدا نہ ہو تو اس کے انتہا تک پہنچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور پھر ہر ابتدا اور انتہا میں تھوڑا یا زیادہ فاصلہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ یہ امر محال ہے کہ ادھر کسی کام کی ابتدا ہوئی اور اُدھر اس کی انتہا بھی ہوگئی۔ انسانی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں میں تو یہ چیز موجود ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے کُنْ فَیَکُوْنُ یعنی ادھر وہ کسی چیز کے ہونے کا حکم دیتا ہے اور اُدھر وہ چیز معرض وجود میں آجاتی ہے لیکن انسان

کو نہ پہلے اور نہ اب یہ طاقت دی گئی ہے کہ جب بھی اس کے دل میں خواہش پیدا ہو یا جب بھی وہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے یا جب بھی وہ یہ کہے کہ مجھے یہ چاہیئے یا میرے حق میں ایسا ہو جائے یا جب بھی اُسے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہو تو وہ چیز اُسے فوراً مل جائے یا اس کا کام فوراً ہو جائے۔ نہ انسانیت کی یہ خاصیت ہے اور نہ اس کی یہ شان ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ انسان کے ساتھ تو یہی لگا ہوا ہے۔ اُس کی تو یہی خاصیت ہے کہ اُسے اپنے ارادہ اور خواہش کو انتہا تک پہنچانے کے لئے محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ دُعا سے بھی اور تدبیر سے بھی مثلاً ایک نہایت ذہین بچہ پیدا ہوتا ہے اُسے اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے برسوں محنت کرنی پڑتی ہے مثلاً اپنوں میں سے لے لو۔ ڈاکٹر عبدالسلام ہیں جو ماشاء اللہ نہایت ذہین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں علم طبعی میں ایک خاص (سائنسی) ذہن عطا فرمایا ہے مگر جس دن وہ پیدا ہوئے تھے اس دن لوگوں کو یہ قطعاً پتہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو کیا چاہیئے لیکن اُن کے اندر اُن کی فطرت میں یہ اَرج (Urgu) موجود تھی کہ میں پڑھوں اور نشو ونما حاصل کروں اور دُنیوی لحاظ سے اپنے مقصود کو پا لوں۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اخلاص بھی دیا ہے لیکن میں اُن کی زندگی کا صرف ایک پہلو بیان کر رہا ہوں جو اُن کی دُنیوی ترقی اور عقل وفراست سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے جب علمی میدان میں قدم رکھا تو انہیں ایک لمبا عرصہ کوشش اور تربیت کے علاوہ پڑھائی کے دنوں میں نہ جانے کن کن تکلیف دہ مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ خدا جانے کتنی تکالیف اُٹھانی پڑیں وہ کتنی راتیں جاگے ہوں گے۔ مہینوں تک اُنہوں نے نیند پوری نہیں کی ہوگی نہ جانے کتنے جائز مشغلوں مثلاً کھیل کُود سے اجتناب کیا ہوگا وغیرہ وغیرہ اور پھر ایک لمبے عرصہ کی محنت کے بعد اُنہوں نے اپنے مقصود کو پا لیا۔ اُنہوں نے جو ابتدا کی تھی اس کی انتہا ہوئی۔ ویسے تو ورلی زندگی کی انتہا انسان کے خاتمہ بالخیر کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اس انتہا کی بعض جھلکیاں وسطِ عمر میں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ ابھی پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُنہوں نے اور کتنی ترقی کرنی ہے لیکن وہ ترقیات کے میدان میں داخل ہو گئے ہیں اور دُنیا نے اُن کے مقام کو ایک حد تک پہچان لیا ہے تو اُن سے تعصب بھی روا رکھا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اُن کو تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن میں نے

اُن کو سمجھایا تھا کہ آپ کوئی فکر ہی نہ کریں۔ اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ آپ کو سب کچھ دے گا۔ انشاء اللہ۔ اسی پر ہمارا توکل ہے اور وہی ہمارا سہارا ہے۔

میں بتا یہ رہا ہوں کہ ہر انتہا کے لئے ابتدا کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر انتہا اور ابتدا کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے کسی ابتدا اور انتہا کے درمیان تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے اور کسی میں زیادہ ہوتا ہے۔ ۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور ایک نئی حکومت بنی۔ پہلے دن ہی وہ دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کے برابر تو نہیں ہوسکتی تھی لیکن پہلے دن سے اُسے اپنی تمام قوتوں اور استعدادوں کی صحیح نشوونما کے لئے کوشش شروع کر دینی چاہیئے تھی تا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس پاک خطہ ارض کو جو مقام دیا یا دینا چاہا وہ ہمیں حاصل ہو جائے۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ بتایا ہے جب میں کالج میں تھا اس وقت ایک ایسا زمانہ بھی آیا جس کے متعلق سوچ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ میرا عام اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اس زمانے میں ایک لاکھ اچھے ذہن ضائع ہوئے حالانکہ اچھے ذہن اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور عطا ہے۔ کسی قوم میں ذہین بچوں کا پیدا ہونا ایک بہت بڑی عطا ہے مگر قوم نے اپنی لاپرواہی سے ذہین بچوں کو اس لئے نظر انداز کر دیا کہ وہ غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے یا مثلاً اس لئے کہ کوئی ذہین بچہ ایسے گھرانہ میں پیدا ہوا تھا جس کی سفارش کوئی نہیں تھی یا نہایت عمدہ ذہن اس لئے ضائع ہو گئے کہ اُن کی ذہنی نشوونما میں ایسی دقتیں تھیں جن کو نہ سمجھا گیا اور نہ دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر ۱۹۴۷ء سے صرف یہ کوشش شروع کر دی جاتی کہ قوم کے ایک لاکھ ذہن ضائع نہ ہوں بلکہ اُن کو سنبھال لیا جائے تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی اور سائنسدانوں کی کمی کا رونا نہ رویا جاتا۔

چند سال پہلے کی بات ہے میں اس وقت تعلیم الاسلام کالج کا پرنسپل تھا پاکستان کے ایک بہت بڑے سائنسدان نے ایک مقالہ لکھا وہ میرے بھی واقف تھے۔ اُنہوں نے وہ مقالہ مجھے بھی دکھایا۔ اس میں لکھا ہوا تھا ہم کیا کریں ہمارے پاس صرف چار پانچ ہزار سائنسدان ہیں جب کہ قوم کو اس سے کہیں زیادہ سائنسدانوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اُن کو کہلا بھیجا کہ میرے نزدیک تم اپنی غفلت کے نتیجہ میں پچاس ہزار سائنسی ذہن تباہ کر چکے ہو اور آج تم یہ رونا رو رہے ہو کہ ہمارے پاس صرف چار، پانچ ہزار سائنسدان ہیں۔ خدا تعالیٰ نے تمہیں صرف چار، پانچ ہزار

سائنسی ذہن نہیں دیئے تھے میرے اندازے کے مطابق خدا نے تمہیں چوّن، پچپن ہزار ذہن عطا فرمائے تھے اور ضروری نہیں کہ میرا اندازہ درست ہو۔ یہ ایک عام اندازہ ہے ممکن ہے ایک لاکھ ذہن دیئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے دو لاکھ دیئے ہوں مگر تم نے ان ذہنوں کو ضائع کر دیا اور اب یہ رونا رو رہے ہو کہ ہمارے پاس اتنے سائنسدان نہیں کہ ہم ترقی کر سکیں۔

پس جب تک ساری دُنیا میں بسنے والے مسلمان اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھیں گے کہ بلند ہاتھ اور دینے والا ہاتھ امت مسلمہ کی ایک بنیادی صفت اور علامت ہے اس وقت تک دُنیا میں ہم وہ مقام حاصل نہیں کر سکتے جو خدا چاہتا ہے کہ امت مسلمہ کو ملے۔ میں جانتا ہوں کہ بہتوں کو میری یہ باتیں اچھی نہیں لگیں گی مگر یہ ایک مسلمان کی زندگی کی بہت بڑی اور بنیادی حقیقت ہے جس کے بیان کرنے سے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ ہمیں پانچویں یا دسویں سال نہایت ہی ذلیل اور رسوا کن حالات میں سے گذرنا پڑتا ہے اور ہم کب تک یہ سنتے رہیں گے کہ فلاں جگہ مسلمان ذلیل ہو گئے۔ اب دیکھو مسلمانوں کی چار لڑائیاں تو اسرائیل کے ساتھ ہو چکی ہیں ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف صف آراء یہی قومیں اپنے گھر میں پالے ہوئے سؤروں سے زیادہ پیار کرتی ہیں لیکن دُنیا میں بسنے والی عظیم مسلمان قوم سے اُن کو کوئی پیار نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہم اُن کے سامنے مدد کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ ہم اُن کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں جو ابتداء سے اپنی بدقسمتی اور جہالت کی وجہ سے اس عظیم نور کو لینے سے انکاری ہیں جو اُن کے انسانی شرف اور مرتبہ کو بلند کرنے کے لئے اُن کی طرف آیا تھا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ وہ لینے والے ہیں دینے والے نہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی تعلیم کی اتنی شان اور اتنا رعب ہے کہ اس کے سامنے عیسائیت اور دہریت ٹھہر ہی نہیں سکتی۔

میں نے پہلے بھی بتایا تھا یورپین لوگ بڑے آزاد ہیں۔ وہ بڑے بڑے لوگوں سے حتی کہ صدر نکسن بھی آجائے تو اُن سے دبنے والے نہیں۔ وہ اُن سے بھی بڑی آزادی کے ساتھ سوال کرتے ہیں لیکن پہلے ۶۷ء میں اور اب میرے حالیہ دورہ میں جہاں کہیں بھی پریس کانفرنس ہوئی اور اس میں جب اسلامی تعلیم کے بنیادی اور حسین پہلو اُن کے سامنے رکھے گئے تو صرف ہاں میں

سر ہلانے کے اور کوئی حرکت اُن میں ظاہر نہیں ہوئی۔ **الحمد للّٰہ علیٰ ذالک** پس لینے کے لئے تو وہ تیار ہیں مگر دینے کے لئے ہم تیار نہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟

میں نے آج کے خطبہ کے لئے دو باتیں منتخب کی تھیں لیکن پچھلے جمعہ کو خطبہ دیتے ہوئے میں بعض نہایت اہم امور کی تفصیل میں لمبا خطبہ دے گیا جس کی وجہ سے مجھے دو دن تک بہت ضعف رہا۔ اس لئے اس وقت میں ایک بات ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی تو عید کے بعد انشاء اللہ دوسری بات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالوں گا۔

تاہم اس وقت میں اس کے متعلق بھی اصولاً کچھ بتا دیتا ہوں کیونکہ کچھ افواہیں کانوں میں پڑ رہی ہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ واضح ہو کر سامنے آئیں کچھ نہ کچھ میری طرف سے بیان ہو جانا چاہیئے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خیر امت کی رو سے امت مسلمہ کے سب سے افضل ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ مسلمان خود قرآن عظیم کو سیکھنے اور نوع انسانی کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے متعلق چند اصولی باتیں (جن کو انگریزی میں آؤٹ لائنز (Out Lines) کہتے ہیں) بتا دیتا ہوں تا کہ وہ ریکارڈ ہو جائیں۔ پس یاد رہے کہ قرآن کریم کو دو طرح سے سیکھا جاتا ہے اور یہ اس لئے کہ خود قرآن کریم نے اپنی دو بنیادی حقیقتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کہتا ہے میں کتاب مبین ہوں، ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں۔ تم اس کے ورق کھولو۔ اس کے بعض مضامین کے متعلق پہلے بزرگوں کی تفاصیل موجود ہیں۔ احادیث کی کتب کھولو ان میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں جو قرآن کریم کی تفسیر پر مشتمل ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن کریم کتاب مبین ہے۔ اس کو یا اس کے متعلقات کو ہر کوئی پڑھ سکتا ہے مثلاً ایک وقت میں ایک نہایت معاند و مخالف اسلام مستشرق مارگولیتھ نے اعلان کر دیا کہ مسند احمد بن حنبل جو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر مشتمل حدیث کی ایک کتاب ہے اور حدیثوں کی کتابوں میں سے ایک بہت بڑی کتاب ہے۔ اس کو شروع سے لے کر آخر تک سوائے میرے (یعنی مارگولیتھ کے) اور کسی نے نہیں پڑھا۔

غرض جہاں تک قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے کا تعلق ہے اس کو مارگولیتھ جیسا معاند اسلام

مستشرق بھی پڑھ سکتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اُسے حافظہ بھی دیا ہو تو وہ بہت سے حصے یاد بھی کر سکتا ہے اور اسی طرح احادیث کو بھی فرفر پڑھ سکتا ہے۔ پس ایک تو قرآن کریم کا یہ پہلو ہے جو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات میں تفصیلاً اور اجمالاً بیان ہو چکا ہے۔ (یعنی آپ کے ارشادات میں کچھ اجمال بھی ہے جس کا تعلق درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے پہلو یعنی کتاب مکنون سے ہے) بہرحال جہاں تک قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے کا تعلق ہے یہ حصہ اس تفسیر اور تفصیل پر مشتمل ہے جو احادیث نبوی میں بیان ہوا ہے یا کچھ حصہ ان رموز واسرار کی تشریح پر مشتمل ہے جو اولیاء اللہ کو سکھائے گئے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے اُن کو پڑھا اور اُن سے استفادہ کیا یہ دیکھ کر کہ فلاں زمانے میں یا فلاں علاقے میں اس اس قسم کے مسائل پیدا ہوئے اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں سے بڑا پیار کرنے والا ہے۔ اس نے اُن میں سے ایک شخص کو کھڑا کیا اور اُس نے اپنے مجاہدہ اور قربانیوں اور تزکیہ نفس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے پیار کو حاصل کیا اور اللہ تعالیٰ سے علم قرآن سیکھا اور بعض اسرار و رموز قرآنی کا علم بھی حاصل کیا جو پہلے گویا چھپے ہوئے تھے اور اس طرح اُس نے اپنے وقت یا اپنے زمانے یا اپنے علاقے کے مسائل کو قرآنی علوم کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی۔ جو بہت سے لوگوں کے لئے سبق آموز اور اللہ تعالیٰ کے پیار کو بڑھانے کا موجب بنی۔ غرض ایک بات جو پہلے اسرار و رموز کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی جب کسی خدا کے بندے پر ظاہر ہوئی تو وہ کتاب مبین کا حصہ بن گئی۔

چنانچہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم کتاب مبین کے علاوہ کتاب مکنون بھی سیکھیں اور قرآنی علوم پر اپنی اپنی قوت اور استعداد کے مطابق عبور حاصل کریں اور جو لوگ قرآن کریم کی عظمت سے ناواقف اور جاہل ہیں اُن تک قرآنی علوم پہنچائیں کیونکہ اس کو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مسلمہ کے خیر ہونے کی ایک علامت قرار دیا ہے۔ خود قرآن کریم نے بھی اس کو خیر کے لفظ سے یاد کیا ہے لیکن یہ ایک بڑی لمبی تفصیل ہے اگر زندگی رہی اور توفیق ملی تو انشاء اللہ اگلے جمعہ کے خطبہ میں بیان کروں گا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قرآن کریم کا ایک دوسرا رُخ ہے۔ اس کا ایک دوسرا پہلو ہے اور وہ ہے کہ اس کا کتاب مکنون ہونا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ ایک عظیم کتاب ہے۔ یہ کتاب

بڑی عظمتوں والی ہے اس لئے کہ اس کا ایک پہلو ظاہر ہے یعنی کتاب مبین پر مشتمل ہے اور اس کا ایک پہلو چھپا ہوا ہے یعنی کتاب مکنون سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس کے اس چھپے ہوئے پہلو کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (الواقعة: ۸۰) یعنی کسی معاند مستشرق کو اس کا علم حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ اُس مسلمان کو حاصل ہوسکتا ہے جسے روحانیت میں ایک خاص اور ارفع مقام حاصل نہ ہو۔ گویا اس حصہ کا علم حاصل کرنے کے لئے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ کی رو سے خدا تعالیٰ کی نگاہ میں (بندوں کی نگاہ میں نہیں) مطہر ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ جب خدا تعالیٰ کی نگاہ میں اس کا کوئی بندہ مطہر ہو کر اس کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کے پیار کو حاصل کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کتابِ مکنون کے اوراق یا اس کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو اس کے سامنے رکھتا ہے اور کہتا ہے آج دُنیا کی یہ ضرورتیں ہیں اور اس کے یہ مسائل ہیں۔ اُن کو حل کرنے کے لئے قرآن کریم نے یہ تعلیم دی ہے تم اس کو سیکھو اور پھر دُنیا کو سکھاؤ اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرو۔

قرآن کریم کا ایک ہی وقت میں کتابِ مبین اور کتاب مکنون ہونے کا دعویٰ کرنا بظاہر یہ باتیں متضاد لگتی ہیں لیکن درحقیقت یہ متضاد نہیں ہیں۔ میں نے اپنوں اور غیروں کے سامنے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ لاریب یہ مضمون انسان کو حیرت میں ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے یہ کتاب تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الواقعة: ۸۱) ہے۔ یہ کتاب ربّ العلمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے یعنی اس ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے جس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے لے کر قیامت تک ایک بالغ انسانیت کی تربیت کے سامان مہیا کرنے تھے اور نوعِ انسانی نے ارتقائی مدارج ہی سے گذرتے ہوئے اپنے لئے ایک سے ایک نئے مسائل پیدا کر لینے تھے اور اس صورت میں ہر زمانے اور ہر علاقے کے انسان کو ربّ العلمین کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی کیونکہ یہ کتاب ربّ العلمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لئے اس کا ایک حصہ کتاب مکنون بنایا گیا ہے جس کا ظہور ہر زمانے کی ضرورت پر منحصر اور ہر وقت ربوبیت اور مطالبہ ربوبیت کی صورت میں مقدر ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ربوبیت ایک فطری مطالبہ ہے جو ہر انسان اپنے رب کریم کے حضور التجا کے رنگ میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اے میرے خدا! میری فلاں مشکل میں میری رہنمائی کے سامان پیدا کر۔ چنانچہ یہ خدا کا قانون اور اس کا منشاء ہے کہ ہر فطری مطالبہ ربوبیت کے وقت خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ کھڑا ہو جسے زمانہ کی ضرورت کے مطابق خدا تعالیٰ اجمالاً یا تفصیلاً یا اجمالاً اور تفصیلاً ہر دو لحاظ سے قرآن کریم کے رموز و اسرار سکھائے اور اس طرح خُدا دُنیا پر یہ ثابت کرے کہ یہ قرآن کریم ہے جو ربّ العلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے یعنی یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس نے آنے والے چودہ سو سال (بعثت نبوی سے لے کر آج تک) کے زمانے یا دو ہزار سال بعد میں آنے والے زمانہ کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ قیامت تک کے لوگوں کی ربوبیت کے سامان بھی اس عظیم شریعت میں چھپا کے رکھے ہوئے ہیں جن کے بتانے کی پہلے ضرورت نہیں تھی اور جن سے بوقت ضرورت پردہ اُٹھایا جانا تھا۔

پس ایک علم قرآنی وہ ہے جو ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے پیارے بندوں سے ہم حاصل کر کے دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ دُنیا کے مسائل آسانی کے ساتھ حل ہو سکیں۔ اگر قرآن کریم کی یہ شان ہے اور یقیناً قرآن کریم ہی کی شان یہ ہے تو پھر کسی ایسے شخص کو قرآن کریم کی تفسیر یا اس کے ترجمہ کی اجارہ داری نہیں دی جا سکتی جو علمائے ظاہر میں شامل ہے یا لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی رو سے مطہرین کی صف میں شامل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عقل اور فراست عطا فرمائے اور قرآن کریم کے علوم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے اور بنی نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ قرآنی علوم سکھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ سب بھلائی اور خیر قرآن کریم میں ہے اس سے باہر نہیں ہے۔

خطبہ ثانیہ کے دوران فرمایا میں دوبارہ یاد دہانی کرا دوں۔ میں اس وقت احباب کو دو دعاؤں کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ ایک تو آپ یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس خیر امت کو اس لحاظ سے بھی خیر امت بنائے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگیں اور اُن کا ہاتھ کسی دوسرے کے سامنے نہ پھیلے اور دوسرے یہ کہ قرآن عظیم جس کے دو پہلو ہیں یعنی اس کا ایک پہلو کتاب مبین ہونے کا

ہے اور دوسرا کتاب مکنون ہونے کا۔ ان دو بنیادی حقیقتوں کو مسلمان سمجھنے لگیں اور نہ سمجھنے کے نتیجہ میں ایسی راہوں کو اختیار نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہوتی ہیں۔

(از رجسٹر خطباتِ ناصر غیر مطبوعہ)

❁❁❁